نظامِ خلافت و امارت
کی
شرعی حیثیت

مولانا عبد العلیم اصلاحی

مکتبہ النجوم
سعید آباد - حیدر آباد

۱

حرف حقیقت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے عین بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ الرسول منتخب کیا گیا۔ تو نظام خلافت کا قیام عمل میں آیا جس کا سلسلہ خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی تک یعنی ۱۳۳۱ سال تک بلا انقطاع رہا۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی کے آمر مصطفیٰ کمال پاشا کی ناعاقبت اندیشی معاندین اسلام کی مخالفانہ سازشوں اور خود عالم اسلام کی غفلت اور خلفشار کی وجہ سے نظام خلافت اسلامیہ کو ختم کر دیا گیا۔

گذشتہ ۷۰ سال سے ملت اسلامیہ بغیر کسی مرکزیت کے اپنے دن گذار رہی ہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ آئی ہے کہ عام مسلمان تو ایک طرف مسلم عالموں اور دانشوروں میں بھی اکثریت ایسوں کی ہے کہ جو نظام خلافت کی اہمیت کو یا تو جانتے ہی نہیں یا اگر جانتے بھی ہیں تو اس معاملہ میں بے اعتنائی برتتے ہیں یا اپنی بے اعتنائی کے لیے کچھ ایسے عذرات تراشتے ہیں کہ اب نظام خلافت کا احیاء ممکن نہیں ہے۔

اس موقع پر نظام خلافت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ خلیفہ قرآن مجید کا اہم تعارفی لفظ ہے جو سہ حرفی مادہ خ۔ل۔ف۔ سے مشتق ہے۔ خلف کے معنی متاخر ہونے۔ پیچھے رہ جانے، بعد میں آنے یا کسی کے جانشین ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ سلف کی ضد ہے۔ جس کے معنی متقدم ہونے یا پہلے گذر جانے کے ہیں۔ اس طرح خلافت کے مرادی معنی قائم مقامی کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے "انسان کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا" (سورہ الانعام۔ ۱۶۵)۔ یہ بات لائق غور ہے کہ اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ انسان کو اللہ کا خلیفہ بنایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا کہنا بے معنی بات ہوتی ہے۔ عام طور پر اس آیت کے معنی یوں لیے جاتے ہیں کہ انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب (vice gerent) مقرر کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ نہ تو انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہو سکتا ہے اور نہ ہی قائم مقام۔ ان معنوں میں اللہ تعالیٰ نے خلافت انسان کے تفویض نہیں کی۔ زمین پر ہر آن فرمانروائی، حاکمی، شاہی اور خدائی سب اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ اور یہ مقام بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ قرآن مجید میں استخلاف کے معنی ایک قوم کی جگہ دوسری کو اس کا جانشین بنانا ہے۔ ان معنوں میں استخلاف کے معنی حاکم یا مقتدر ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقرر کردہ قانون "بقائے اصلح" کے تحت ایک نوع مخلوق کو دوسری کا جانشین یا قائم مقام بناتا رہا۔ عالم حیوانات کی کشمکش حیات میں جسمانی زور ہی کسی جنس کے قیام کے لیے کافی نہیں بلکہ بقا۔ کا اصلی راز صلاحیت اور

استعداد ہے۔ جس نوع حیوانی میں موانعات فطرت کے مقابلہ کی صلاحیت پائی گئی وہی قانون الٰہی کے مطابق مستخلف فی الارض یعنی حاکم قرار پائی۔ اگر یہ قانون نہ ہوتا تو آج وہ عظیم الجثہ جانور جو انسان کی خلقت سے لاکھوں سال قبل روئے زمین پر کثرت سے موجود تھے دنیا پر مسلط ہو جاتے، غرض ایک نوع کو اللہ تعالیٰ دوسری نوع کا جانشین بنایا رہا تاآں کہ اس نے انسان کو خلیفہ یعنی دوسری انواع کا جانشین یا بہ الفاظ دیگر روئے زمین پر حاکم بنایا سورہ انعام کی متذکرہ آخری آیت اور سورہ فاطر کی آیت ۳۹ کا بھی مفہوم ہے۔ "وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں خلیفہ (حاکم) بنایا" (۳۵-۳۹)

اللہ تعالیٰ انسانوں میں بھی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو اس کا جانشین بناتا ہے چنانچہ فرمایا "سو اگر تم پھر جاؤ تو میں تمھیں وہ (پیام) پہنچا دیا ہے جو مجھے دیکر تمھاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمھارے بجائے دوسرے لوگوں کو خلیفہ (دوسری اقوام کا جانشین اور حاکم) بنادے گا۔ اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے" (۱۱-۵۷)

اسی طرح فرمایا:

"اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ (سابقہ امتوں کا قائم مقام اور حاکم) بنایا ہے۔ (۳۸-۲۶)

اسی طرح فرمایا:

اور یاد کرو جب اس (تمھارے رب) نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا خلیفہ (جانشین یعنی حاکم) بنایا سورہ الانعام آیت۔ (۲۹) ع ۱/۱

انسانی معاشرہ کی حد تک بقاء کے لیے ایمان اور اعمال صالح لازم و ملزوم ہیں جس جماعت کے افراد میں یہ دونوں باتیں ہوں وہی اصلح ہے۔ اس خلافت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ شرط رکھی ہے کہ انسان ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دے۔ آیت استخلاف میں ارشاد ہوا:

"اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ (حاکم مقتدر) بنایا جائے گا جس طرح ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کو خلیفہ بنایا جا چکا ہے" (سورہ نور آیت ۵۵)

سورہ الانبیاء میں بھی آیت استخلاف کا مفہوم ایک دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے:

"اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہونگے" (سورہ الانبیاء آیت۔ ۱۰۵)

ع ۱/

انسان کو اللہ کا خلیفہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ اس اختلاف سے اصل مسئلہ پر کوئی فرق نہیں (ع ع اصلاحی)۔

متذکرہ دونوں آیتوں میں خلافت اور وراثت تقریباً ایک ہی معنوں میں استعمال کیئے گئے ہیں چاہے خلافت (جانشین) ہو یا وراثت، امم سابقہ کی ہے اور حکومت اور اقتدار کے معنی میں ہے جب ایک قوم اپنی صلاحیت (ایمان اور نیک عمل) کھو دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہٹا کر اس کی جگہ ایسی قوم کو لاتا ہے جو باایمان ہو، عمل صالح کو اپنا شعار بنا چکی ہو۔ کسی قوم کو ہٹانے کا لازماً یہ مطلب نہیں کہ اس قوم کو بالکل نیست ونابود کر دیا جاتا ہے۔ ایک قوم کو ہٹانے کے بعد بھی اس قوم کے افراد موجود ہوتے ہیں۔ اس کی جگہ جس قوم کو لایا جاتا ہے اس کے افراد بھی پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ پھر ایک قوم کو دوسری قوم کا جانشین بنانے کے کیا معنی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی صلاحیت کے بموجب اس کو اقتدار سے نوازتا ہے۔ ایک قوم کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو اس کا جانشین بنانے کے معنی ایک قوم کو اقتدار سے محروم کر کے اس کی جگہ دوسری قوم کو اقتدار سے نوازنا اور دنیا کی امامت تفویض کرنا ہے۔ قوموں کو اقتدار سے نوازنے یا ان کے اقتدار سے محروم کرنے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے مقرر کیئے ہوئے قانون کے تحت انتہائی انصاف سے ہوتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایمان کی حامل اور اعمال صالحہ کی پابند تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون اور وعدہ کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اس جماعت کو یعنی امت مسلمہ کو زمین کا خلیفہ بنایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متفقہ طور پر اپنا امیر منتخب کیا تو وہ بجا طور پر خلیفۂ رسول کہلائے یعنی رسول کے بعد آنے والے یا ان کے جانشین۔ اس طرح مابعد قرآنی لٹریچر میں لفظ خلافت اس عظیم نظام کے لیے استعمال ہوا جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور دنیا کی امامت کا فرض ادا کیا۔

خلافت کی بنیاد پچھلے کسی سیاسی نظام مثلاً قیصر وکسریٰ یا عرب قبائلی نظم کے انداز پر نہیں رکھی گئی بلکہ وہ ایک جدید نظام تھا جس کی بنیاد قرآن مجید کے اس بلند خیال پر رکھی گئی کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور مسلم عوام کو جو ملکی اختیارات حاصل ہیں اور اقوام عالم میں جو نمایاں مقام حاصل ہے ان کی حیثیت ایک مقدس امانت کی ہے۔

منہاج نبوت

اس موقع پر منہاج نبوت کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ منہاج کے معنی ہیں راستہ، دستور یا طریقہ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تھے۔ آپ کے بعد کوئی رسول یا نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے بعد فرائض رسالت مسلمانوں کی جماعت کو تفویض ہوئے۔ یہ ایک ایسا عظیم اعزاز اور بڑی ذمہ داری ہے کہ سابق میں کسی امت کو یہ اعزاز اور ذمہ داری حاصل نہیں ہوئی۔ امت مسلمہ من حیث الکل منہاج نبوت پر فائز ہے یہ حق مشترکہ طور پر باعث عزت اور موجب فخر تو یقیناً ہے لیکن اگر امت کا کوئی فرد یہ ادعا کرے کہ وہ منہاج نبوت پر فائز ہے تو اس کا دعویٰ قطعی باطل قرار پائے گا۔ یہ حق اور یہ ذمہ داری امت مسلمہ کی مشترکہ امانت اور اجتماعی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان جسد واحد کی حیثیت سے ملی زندگی بسر کریں اور وحدت خیال اور وحدت عمل کا اظہار کریں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ امت مسلمہ کا دینی اور دنیوی خلیفہ (امیر المؤمنین) ہو جو تمام مسلمانان عالم کے اقتدار کا مظہر ہو

خلافت ایک ایسا عجیب وغریب ملٹی نیشنل (multi national) ادارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بموجب ایک قوم کی جگہ دوسری قوم اس کی جانشین ہوتی رہی اور یہ سب امتیں خلافت کے دائرہ میں رہیں۔ عربوں کی سیاست ختم ہوئی تو ترکوں، سلجوقیوں، تاتاریوں وغیرہ نے یکے بعد دیگرے عنان قیادت سنبھالی۔ ایک ایک قوم آگے بڑی اور اس نے مرکزی کردار ادا کیا۔ خلافت قائم رہی اور مرکزیت باقی رہی۔

انسانیت کی نشوونما ایک ایسی انسانی جماعت کی ذمہ داری ہے جو خالق کائنات کے منشاء کے تحت اس اہم اور مقدس کام کو شعوری طور پر انجام دے خلافت کو ایسی انسانی جماعت کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔

مسلمانوں کی حیات اجتماعی کا سب سے بڑا سانحہ سلسلہ خلافت کا انقطاع ہے خلافت کا خاتمہ خود مسلمانوں کے زوال کی علامت تو تھا لیکن اسلام کے انحطاط اور مسلمانوں کے قیادت اور خلافت سے محروم ہو جانے سے دنیا ایک نظریہ حیات اور عملی نظام سے محروم ہو گئی۔ انسانی زندگی کا لائحہ عمل متاثر ہو گیا اور غلط فلسفیانہ تصورات کا اثر فضا میں چاروں طرف پھیل گیا، اگر خلافت قائم رہتی اور مسلمان اپنے بنیادی فرض کو انجام دیتے ہوئے علوم اور فلسفوں کو اس ذہن سے آگے بڑھاتے جس کی نشاندہی قرآن مجید میں کی گئی ہے تو باطل فلسفے اس طرح ہرگز فروغ نہ پاتے جس طرح ان کا فروغ ہم بھگت رہے ہیں۔ اور اس طرح دنیا کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ خلافت کا خاتمہ ہوا اور علوم سے مسلمانوں کو سروکار نہ رہا تو کفر نے مغرب کے جدید فلسفیانہ تصورات کے بعض حقائق اور علم کو لیکر اور اس میں باطل کی آمیزش کر کے استدلال کی قوت کے سہارے ان کو دنیا میں پھیلادیا۔ موجودہ تہذیب کی تمام خرابیوں

اور کوتاہیوں کی ایک اہم وجہ بھی باطل فلسفے ہیں، انہی باطل نظریات کی کوتاہیوں سے موجودہ دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔ دنیا کو ان سے نجات دلانا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔

مسلمان ہی دنیا کی مسلمہ علمی صداقتوں کے وارث ہیں کیونکہ یہ صداقتیں قرآن مجید کے حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ جب مسلمانوں نے ان علمی صداقتوں کی تلاش بند کردی اور ان کی ترقی میں اپنا حصہ ادا نہ کیا تو یہ علمی صداقتیں نہ صرف باطل کے ساتھ ملوث ہوگئیں بلکہ باطل فلسفوں کی زینت بن گئیں۔ بہ الفاظ دیگر علمی صداقتوں کے بل بوتے پر باطل کی جلوہ فروشی خلافت کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں نے خلافت کو ختم ہوجانے دیا۔ بلاشبہ یہ ایک مجرمانہ کوتاہی تھی۔ دنیا کو مسلمانوں کی خلافت کے ختم ہوجانے سے بدقسمتی سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حالات اس وقت تک تبدیل نہیں ہوسکتے جب تک کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور ناخدا ترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر دین کے علمبرداروں کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔

اگر خلافت کا نظام قائم رہتا تو مسلمان علحدہ علحدہ غول کی شکل میں نہ ہوتے بلکہ خلافت اسلامیہ کے تحت ان کی حیثیت امت واحدہ کی ہوتی۔

خلافت کے اختتام اور مسلمانوں کے انحطاط کے نتیجہ میں جو قوتیں ابھریں وہی آج کی دنیا کی تمام خرابیوں کا اصل سبب ہیں۔

لیکن ان سب باتوں سے زیادہ اہم اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ خلافت مسلمانوں کے لیے ایک دینی ضرورت ہے۔ خلافت کا قیام جو اسلامی مملکت کی مستند شکل ہے محض ایک سیاسی نظام ہی نہیں بلکہ ایک شرعی ضرورت ہے جس کے بغیر دین کے اہم ارکان متاثر ہیں۔ نظام خلافت، اسلام کی بقا، اس کی عالمی ترویج اور مدافعت کے لیے ناگزیر ہے۔ خلافت سے محرومی شریعت کے بنیادی احکام کے اعتراض کے مترادف ہے۔ جہاں تک دینی ضرورت کا تعلق ہے صرف چند امور لائق غور ہیں۔ اسلام میں نہ کلیسائی نظام ہے نہ پروہتی نظام۔ لیکن اسلامی عبادات کی ادائی میں تنظیم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسلام اپنے پیرووں پر جو فرائض عائد کرتا ہے ان کی بجاآوری باہمی ربط کے بغیر ممکن نہیں۔ بعض فرائض نوعیت کے اعتبار سے صریحاً اجتماعی ہیں۔ پروہتی نظام سے بچنے کے لیے اسلام نے ایسی ملت منظم کی جو اجتماعی فرائض ادا کرسکے اسلامی مملکت کی بنیادی غرض بھی ہے کہ وہ ملت کی تنظیم کی سربراہ ہو۔

صلوٰۃ دین کا دوسرا اہم رکن ہے امیر المؤمنین اور ان کے تحت تمام اصحاب اقتدار کا فرض ہے کہ اقامت صلوٰۃ کا اہتمام کریں۔ صلوٰۃ جمعہ کی تنظیمی سطح پر بڑی اہمیت ہے۔ خطبہ جمعہ کی اہمیت کا سرسری اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مسلمانان عالم کا خواہ وہ حدود خلافت میں رہتے ہوں یا باہر، ایسا پلیٹ فارم ہے، جہاں مقررہ دن اور مقررہ وقت پر سب مسلمان جمع ہو جاتے ہیں۔ خطیب جمعہ کا خلیفہ کی جانب سے مقرر کیا جانا ضروری ہے۔ خطبہ جمعہ خلفاء کے تسلسل کے اظہار اور خلیفہ وقت کے نام سے یا اس کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں خلیفہ کا نام لینا رسماً ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ خلیفہ کی عدم موجودگی میں خطبہ جمعہ کی افادیت اور معنویت باقی نہیں رہی

جو لوگ جلسے منعقد کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں اس دشواری کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو جمع کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ تاریخ اور وقت کا تعین کرنا۔ سب کو اس کی اطلاع دینا۔ جلسہ کے لیے مقرر کا انتظام کرنا وغیرہ۔ اسلام نے دن۔ وقت مقام اور خطیب کے انتخاب کے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے پلیٹ فارمس کا مستقل اہتمام کر دیا۔ اور اس نزاکت کے ساتھ کہ تمام دنیا میں پڑھے جانے والے خطبات جمعہ مشترکہ حکمت عملی کی نشاندہی کرتے ہیں اور ایک ہی مرکزی قوت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہ ایسا اہتمام ہے جو عقل انسانی کو دنگ کر دیتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی غیر معمولی ترقیوں کے باوجود ایسے خودکار اور مکمل انتظام کا کوئی جواب نہیں۔ یہ سارا اہتمام اور اس کا ڈھانچہ عملاً تو باقی ہے لیکن اس کا ایک اہم بنیادی جز یعنی خطیب کو مقرر کرنے والی اتھارٹی باقی نہیں۔ جس کے نتیجہ میں خطبہ جمعہ کی روح اور اس کی افادیت سے مسلمان محروم ہو گئے۔

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ عام صدقات و خیرات اور زکوٰۃ میں ایک واضح فرق ہے۔ صدقہ و خیرات اختیاری ہیں جب کہ زکوٰۃ کی ادائی لازمی ہے۔ صدقہ و خیرات ایک فرد دوسرے فرد کو دیتا ہے۔ جس کو دیا جائے اس پر دینے والے کا احسان ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی رقم بطور ٹکس خلیفہ وصول کرتا ہے۔ اور جو افراد مستحق شرعی ہوں ان کو پہنچا دی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی ادائی میں کسی احسان کا تصور نہیں۔ خلافت کی عدم موجودگی میں اسلام کا یہ بنیادی رکن متاثر ہے۔ اور ایک انفرادی عمل اور اختیاری فعل بن کر رہ گیا ہے۔

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ حج کے موقع پر تمام دنیا سے آئے ہوئے مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع میں خطبہ خلیفہ وقت یا ان کی جانب سے نامزد کئے ہوئے امیر حج کی ذمہ داری ہے۔ خلیفہ کی عدم موجودگی میں اسلام کا یہ اہم رکن متاثر ہے۔

جہاد اسلام کا اہم رکن ہے -. جہاد کی بنیادی اہمیت اس کے حکم کی برتری ہے اس اہم اور مقدس کام کی ادائی میں اجتماعی تنظیم بیحد ضروری ہے - اس کام میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئیں مسلمانون کے لیے ضروری ہے ان کو برداشت کریں - پوری طاقت سے جدوجہد کریں اور ہر قسم کی قربانیاں دیں - رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش بھی جہاد ہے - اللہ کے حکم کی برتری میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں اور غنڈہ گردی کی جائے تب آخری تدبیر کے طور پر اس کا مقابلہ کیا جائے اور اپنی جان کی بازی لگادی جائے - خلیفہ کے حکم کے بغیر جہاد کی یہ آخری شکل مسلمانوں پر فرض نہیں - ابتدائی تمام کوششیں بھی ان ہی خطوط پر ہونا ضروری ہے - جن کی نشاندہی خلیفہ وقت کی جانب سے ہوں - خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے اسلام کا یہ اہم رکن متاثر ہے -

یہی حال دوسرے احکام کا ہے - قرآن مجید میں ناپ تول کا خیال رکھنے کی تاکید بار بار آئی ہے - ان احکام کی تعمیل اور پابندی امیرالمؤمنین ہی کے حکم سے ہوتی ہے جو محتسب کے ذریعہ اوزان اور پیمانہ جات پر نظر رکھتے ہیں اسی طرح محتسب اس بات کی نگرانی بھی کرتے ہیں کہ احتکار (ذخیرہ اندوزی) نہ ہونے پائے اور یہ صنعت وتجارت میں جھوٹ - خیانت اور فریب دہی نہ ہو -

یہ تو رہی ارکان اور احکام اسلام کی بات - اگر غور سے دیکھیں تو خود قرآن مجید کے بیشتر احکام خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے نافذالعمل باقی نہیں رہے - قرآن کا واضح حکم ہے - اطاعت کرو اسلام کی - رسول کی - اور ان کی جو تم میں اولی الامر ہیں - (سورہ النساء - ۵۹) اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ اولی الامر صرف امیرالمؤمنین (خلیفہ) ہوسکتا ہے - ورنہ دنیا کے مسلمان اپنے اپنے علاقوں کے حکمرانوں کو اولی الامر تسلیم کریں تو ویسی ہی سر پھٹول ہوگی جیسی کہ آج ہورہی ہے - اولی الامر کی عدم موجودگی ایک عجیب وغریب صورتحال ہے - جس کی سنگینی کا پورا پورا اندازہ ایک حالیہ واقعہ سے ہوتا ہے - کلکتہ ہائیکورٹ میں درخواست رٹ پیش ہوئی کہ قرآن مجید کی چوبیس آیتوں کو (band) کیا جائے - اگر یہ درخواست رٹ منظور ہوجاتی تو ہندوستان کی حد تک چند آیات قرآنی پر پابندی عائد ہوجاتی - لیکن نظام خلافت کے برخاست ہوجانے سے قرآن بے اثر اور کم اثر ہوگیا - وہ تمام آیتیں جو خلافت اور اجتماعی زندگی سے راست یا بالواسطہ متعلق ہیں تلاوت کے لیے تو رہ گئیں لیکن معناً سب معطل ہوگئیں اور یہ سب اس اندازے ہوا کہ مسلمان اس صورتحال کی سنگینی کا پورا ادراک نہ کرسکے -

خلافت اسلامیہ کو ختم ہوئے ستر سال گزر گئے - اس مدت میں ملت اسلامیہ کو جو نقصان پہنچا اسکو تصور میں

لانا مشکل ہے ۔ گویا ستر صدیاں گزر گئیں ۔ بیسویں صدی عیسوی کے فوائد سے یکسر محروم ہو کر اب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو رہے ہیں ۔ بیسویں صدی میں آزادی اقوام کی ہوا چلی ۔ خلافت اسلامیہ کے مختلف صوبوں کو جو خلافت اسلامیہ کے خاتمہ کے بعد برطانوی ۔ فرانسیسی اور دوسرے سامراجی ممالک کے غلام تھے ۔ آزاد کیا گیا لیکن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ اسلام کو عرب و عجم کی تقسیم کا روادار نہ تھا ۔ اب خود عرب کی ریاستیں بیسیوں ذیلی وحدتوں میں بٹ گئیں ۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد سامراجی طاقتوں یعنی برطانیہ ۔ فرانس ، امریکہ اور روس نے اپنے ساختہ و پرداختہ مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو انتشار و اختلافات میں الجھائے رکھا مسلمان حکمران جو شخصی مفاد کی بناء پر سامراجیوں کے آلہ کار بن گئے ۔ اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مغربی افکار سے مرعوب ہے دونوں احیائے خلافت کی راہ میں رکاوٹ بنے ۔ ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ذہنوں سے خلافت کی عظمت کو محو کرنے کے نت نئے طریقہ اختیار کیئے گئے مثلاً خلیفہ بین الاقوامی سطح پر مسلمانان عالم کے اقتدار کا مظہر ہوتا ہے اور بیک وقت دنیا میں ایک ہی خلیفہ ہوتا ہے ۔ اردو میں لفظ خلیفہ کو نائی ۔ درزی وغیرہ پیشہ کرنے والوں کو کہتے ہیں ۔ یا پھر صوفیوں کی اصطلاح میں خلیفہ ان مریدوں کو کہا جاتا ہے جنھیں مرشد بیعت لینے کی اجازت دیتے ہیں ۔ خلیفہ کے معنی خواہ سوقیانہ ہو یا صوفیانہ اصل لفظ کی جو عظمت تھی وہ ذہنوں میں باقی نہ رہیں ۔ اور عملی گلی خلیفہ ہوگئے ۔ اس کے باوجود یہ بات خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس دینی ضرورت کو تسلیم کرنے تیار ہے اور ملت کا سواد اعظم اس انتشار اور اختلاف سے بری ہے جس میں دشمنان اسلام کے خود غرض ایجنٹ الجھے ہوئے ہیں ۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ ہر قوم کو اپنے ورثہ کے تحفظ کی خواہش ہوتی ہے ۔ امت مسلمہ کے لیے یہ ورثہ خلافت اسلامیہ کا تسلسل ہے ۔ خلافت کے احیاء ہی سے انشاءاللہ مسلمانوں کے بلکہ عالم انسانیت کے تمام مسائل حل ہوں گے ۔

بعض گوشوں سے اس قسم کے شیطانی وسوسے پیدا کیئے جاتے ہیں کہ خلافت کا احیاء مشکل بلکہ ناممکن ہے ۔ مسلمانوں کا ذہن اس تعلق سے بالکل صاف ہونا چاہیے ۔ اگر خلافت ایک دینی ضرورت ہے اور انسانیت کی موجودہ خرابیوں کا واحد حل ہے تو اس کا احیاء ہونا چاہیے ۔ اگر اسلام حق ہے اور امر خلافت اسلام کی بنیادی ضرورت ہے اور اگر مسلمانان عالم کا روئے زمین پر بالاخر ایک اہم عنصر بننا منشاء الہی ہے تو خلافت اسلامیہ کا قیام ضرور عمل میں آئیگا ضرورت وسیع پیمانہ پر احساس پیدا کرنے کی ہے ۔ عزم کی ہے ۔ استقامت کی ہے ۔ یقین کی ہے ۔ اور سعی و کوشش

کی ہے - اس بات کو مسلمانوں میں عام کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی اور نظام خلافت کا بدل نہیں ہوسکتا - بین الاقوامی سطح پر مختلف اسلامی ادارے مثلاً رابطہ العالم اسلامی - اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس اور ایسے ہی دوسرے ادارے خواہ کتنے ہی مفید خدمات کیوں نہ انجام دیں خلافت کے متبادل نہیں ہوسکتے -

ایسا نہیں کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت کو ختم کر دیا گیا تو مسلمانان عالم نے اس صورتحال کو بے چوں وچرا تسلیم کر لیا - امت اسلامیہ کی اہل نظر شخصیتوں نے جن میں برصغیر کے مولانا محمد اور سید سلیمان ندوی - روس کے موسیٰ جاراللہ مصر کے محمد علی علوبہ پاشا اور سید رشید رضا مدیر المنار، انڈونیشیا کے سعید عمر شکر ومنتو اور عرب لیگ کے مفتی امین الحسینی شامل تھے - باہم صلاح ومشورہ کر کے ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں ایک جمعیت حج کے اجتماع کے موقع پر قائم کی اور اس کا نام موتمر العالم اسلامی رکھا - یہ ادارہ اس وقت تک قائم ہے - دنیا کے ۶۲ ملکوں میں اس کی شاخیں یا ملحقہ ادارے قائم ہیں - جو کوشش کر رہے ہیں کہ خلافت کا پھر سے احیاء ہو -

خلافت کے قیام کے سلسلہ میں کچھ دستوری تجاویز بھی سامنے آئی ہیں: پروفیسر آل احمد عابدی پرنسپال گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان نے ریاست ہائے متحدہ اسلامیہ کے قیام کے مقصد سے آئینی تجاویز کا خاکہ مرتب کیا جس کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے رابطہ العالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ میں پیش کیا - اس کا اردو ترجمہ "جذب باہم" کے نام سے کاروان ادب ملتان نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا - یہ مسلم مملکتوں کے کنفیڈریشن کے قیام کی تجویز ہے - کنفیڈریشن کی حکومت صدر، انتظامیہ، مجلس ملی اور مجلس علماء پر مشتمل ہوگی - مجلس ملی کی تشکیل کے لیے ہر رکن ریاست سے ۱۱ نمائندے لئے جائیں گے - صدر کا انتخاب پانچ سال کے لیے ہوگا - مجلس علماء ۳۱ عالموں پر مشتمل ہوگی - اس دستوری خاکہ کا مقصد اسلامی نظریاتی محرکات پر مبنی مسلم مملکتوں کی سیاسی وحدت قائم کرنا ہے لیکن دستور میں کسی جگہ اور نہ ہی پیش لفظ اور دیباچہ میں احیاء خلافت کی بات کی گئی ہے - دستور میں کنفیڈریشن کے صدر کے لیے خلیفہ یا امیر المؤمنین کا لقب استعمال نہیں کیا گیا - اس طرح ایک مفید تجویز کو خلافت کے احیاء سے قریب تر لانے کے باوجود یہ سکوت بری طرح کھٹکتا ہے -

حیدرآباد سے جناب سید شاہ معین الدین محمد محمد الحسینی فیض نے اپریل ۱۹۶۹ء میں ایک مسودہ دستور خلافت اسلامیہ مرتب وشائع کیا - اس دستور کا خاکہ جمہوری اساس پر مرتب کیا گیا ہے - اسلامی مزاج کو ملحوظ رکھا گیا ہے - دستور کے بموجب دول اسلامیہ اس عظیم ادارہ کے رکن ہونگے - غیر مسلم ممالک کی حد تک مسلم آبادی کے اساس

پر ادارہ کے ارکان کا انتخاب عمل میں آئیگا۔

ضرورت ہے کہ ان بنیادی خاکوں کو سامنے رکھ کر تجاویز مرتب کی جائیں۔ مسلم رائے عامہ کو ہر ملک میں ہموار کیا جائے۔ غیر مسلم رائے عامہ کو بھی ان خطوط پر ہموار کیا جائے کہ ادارہ خلافت تمام عالم انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ احیاء خلافت کے راستہ میں جو رکاوٹیں نظر آئیں ان کو دانشمندی اور حکمت سے دور کرنا چاہیے۔ وہ دن دور نہیں کہ خلافت کا احیاء ہوگا اور باب عالی سے ایسے فیصلے صادر ہونگے جو انسانیت کے لیے فلاح کا باعث ہونگے اور الٰہی نظام سربلند و کامران ہوگا۔

راقم الحروف نے احیاء خلافت کے سلسلہ میں ایک استفتاء مرتب کر کے علمائے کرام کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ مولانا عبد العلیم اصلاحی نے اس استفتاء کو دیکھ کر فرمایا کہ انہوں نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں استفتاء کے تمام سوالات کا احاطہ موجود ہے۔ میں نے اس مقالہ کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ مولانا نے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ اور نظام خلافت کی شرعی حیثیت پر نہایت عالمانہ نظر ڈالی ہے۔ یہ مقالہ اس سے قبل رسالہ رہگزر میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ بات موجب مسرت ہے کہ اب اس کو علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ نظام خلافت کے بارے میں یہ چند سطور اہل نظر کی توجہ کے لائق متصور ہونگے۔

فقط۔ حسن الدین احمد

عزیز باغ۔ حیدر آباد ۲۴

۱۰ جنوری ۱۹۹۳

تمہید

نظام خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے، اس موضوع پر گفتگو کیلئے بطور تمہید موجودہ عالم اسلام کے ایک مستند عالم باعمل کے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔

"اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں ہے چند مختلف لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں، وہ زندگی کا نظام ہے وہ زمانہ کی فضا طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے۔ اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد و معیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ صرف اسی کو قانون سازی اور تنفید کا حق حاصل ہو۔ اسی کے صحیح نمائندے دنیا کیلئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے :۔ الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (۲۲-۴۱)

ترجمہ :۔ یہ مظلوم مسلمان وہ ہے کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا "یعنی ان کا حکم چلنے لگا تو وہ" نماز قائم کریں گے ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ایک اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے نظام عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں، مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی فوجداری معطل ہو جاتا ہے اسی لیئے قرآن غلبہ و عزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لیئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی۔ اور اس کو اکابر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین پر مقدم رکھا۔ جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کیلیئے حضرت حسین رضؓ نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نااہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔" (الخ۔ سیرت احمد شہید حصہ اول صفحہ ۵۰، ۵۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

"اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں۔ ان میں عبد و معبود کے تعلق کی اصلاح و تعظیم پھر اس کی ترویج و توسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے۔ ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب پرسکون اور پرامن زندگی کیلیئے فضا ہموار کرنا بھی ہے جس میں خالق کے فرائض مخلوق کے حقوق دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقع اور ان کمالات اور ارتقائی منازل تک پہنچنے کا پورا امکان پایا جائے۔ جس کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو جو کبھی غیر منظم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں کبھی خود ساختہ قوانین کبھی مطلق العنانی اور جاہ و اقتدار کی ہوس سے۔ اس کے لیئے ایک منزل من اللہ قانون، آسمانی شریعت اور خدا کی الوہیت و حاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظام خلافت و امارت ضروری ہے۔ (الخ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم ص ۲۵۹ مولانا سید ابوالحسن علی

تین مسلمات

۱۔ اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے۔ یہ سمجھنا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر ہے یا کسی شعبہ زندگی میں اس کی تعلیم ناقص ہے۔ نصوص شرعیہ سے انکار کے مترادف ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

آج میں نے تمہارے لیئے دین کو مکمل کر دیا تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا۔

اس کا مطالبہ پورے دین کو اختیار کرنا ہے۔ اونے پونے کی سودا بازی ناقابل قبول اور باعث ہلاکت ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

تو کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو پس یہ تم میں سے جو بھی کریں گے ان کا بدلہ دنیا میں صرف رسوائی ہے اور روز قیامت شدید ترین عذاب میں دھکیلے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

قرآن اور سنت اور ان کی بنیاد پر علماء اسلام نے فقہ کے نام سے جو ایک جامع قانون مرتب کر دیا ہے۔ اس کا آپ مطالعہ کریں اور دیکھیں انسانی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس کے متعلق اصولِ قانون اور قانونی نظائر موجود نہیں ہیں۔

علامہ ابن نجیم نے امور دین کو جن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا

جاسکتا ہے کہ ہر دور میں اسلام کو کامل نظامِ زندگی سمجھایا گیا ہے۔

جان لو امور دین اعتقادات، عبادات، معاملات حدود و تعزیرات اور آداب سے متعلق ہیں۔ اعتقادات کی پانچ قسمیں ہیں۔ (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالملائکہ (۳) ایمان بالرسول (۴) ایمان بالکتب (۵) ایمان بالیوم آخر

عبادات بھی پانچ ہیں: نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد۔ معاملات بھی پانچ ہیں: مالی معاوضات، مناکحات، مخاصمات، امانات، ترکہ و میراث۔ حدود و تعزیرات بھی اصلاً پانچ چیزوں سے متعلق ہیں: قتل نفس، سلب مال، ہتک ستر، ہتک عزت، قطع نسل۔ آداب چار ہیں: اخلاق، شمائل حسنہ، سیاسیات، معاشرتی مسائل۔

"البحر الرائق کتاب الطہارۃ"

صاحب ہدایۃ کتاب البیوع میں لکھتے ہیں: لان البیع انشاء تصرف والانشاء یعرف بالشرع یعنی بیع ایک تصرف کا پیدا کرنا ہے اور تصرف کا پیدا کرنا شریعت سے معلوم کیا جاتا ہے اس فقرہ میں دراصل ایک اصول بتایا گیا ہے کہ اللہ کی اس زمین پر تصرف کیلئے شریعت کی اجازت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ فقہا نے احکام کی ایسی تقسیم کی ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اور کوئی حرکت، کوئی فعل، کوئی حادثہ اور واقعہ اس سے باہر نہیں ہو سکتا۔

ان کے نزدیک احکام کی دو قسمیں ہیں۔ عزیمت اور رخصت۔ عزیمت اصل ہے اور وقتی عوارض کی بنا پر جو حکم لگایا جاتا ہے اسے رخصت کہتے ہیں۔ عزیمت کے اقسام فرض، واجب، سنت، نفل، حرام، مکروہ اور مباح ہیں۔ آج تک مسائل اور معاملات کی کوئی ایسی قسم نہیں معلوم ہو سکی اور نہ قیامت تک وقوع پذیر ہو سکتی ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ شرعی احکام کے تحت نہیں آتی۔

اوپر ہم نے فقہی تصریحات نقل کی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے جو لوگ زندگی کے بہت

شعبوں کو دین سے خارج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں فلاں معاشی مسئلہ ہے۔ یہ حکومت کی باتیں ہیں۔ یہ دنیاوی معاملہ ہے دین کو ان سے کیا بحث۔ ایسے لوگ درحقیقت یا تو مرعوبیت اور ہوی پرستی کے شکار ہیں یا پھر دینی شعور سے نابلد۔

۲ **اللہ تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہے:** شریعت اسلامی جب ہر شعبہ زندگی کے لیئے اپنا ایک مخصوص حکم اور قانون رکھتی ہے اور ناقص نہیں ہے تو لازماً وہ ہرگز اس بات کی روادار نہیں ہو سکتی کہ کوئی اس کے حدود سے ذرہ برابر تجاوز کرے اور غیر خدا کی حاکمیت تسلیم کرے خواہ وہ انسان کا اپنا نفس ہو یا کوئی غیر الٰہی حکومت یا کسی ملک کے جمہور اور عوام قانون کی ہمہ گیری سے قانون ساز کی ہمہ گیری از خود ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک حاکم اعلیٰ صرف ایک ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ حکم صرف اللہ کیلئے ہے۔

فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ حکم اللہ ہی کیلئے ہے جو بالادست اور بڑا ہے

لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے

فقہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے: والذی یعلم من التوضیح فی ضبطها ان الحکم مفتقر الی الحاکم والمحکوم علیه والمحکوم به فالحاکم هو الله تعالیٰ والمحکوم علیه هو المکلف والمحکوم به فعل المکلف (نور الانوار ص ۲۶۶)

قواعد کے ضبط میں توضیح سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حکم محتاج ہے حاکم محکوم علیہ اور محکوم بہ کا پس حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور محکوم علیہ مکلف اور محکوم بہ مکلف کا فعل ہے۔ توضیح میں مزید وضاحت:

القسم الثانی من الکتاب فی الحکم ویفتقر الی الحاکم وهو الله تعالیٰ لا العقل علی مامر فی باب الامر (ص ۶۰)

کتاب میں سے قسم ثانی حکم کے بارے میں ہے اور حکم محتاج ہے حاکم کا اور وہ اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ عقل جیسا کہ باب الامر میں گزر چکا۔ لاحکم الا من الله تعالیٰ باجماع الائمة لاکمافی

کتب بعض المشائخ ان ھذا عندنا وعند المعتزلہ الحاکم العقل فان ھذا مما لایجتری علیہ احد ممن یدعی الاسلام
(شرح مسلم الثبوت صہ ۱۳)
حکم صرف اللہ کا ہے اس پر ائمہ کا اجماع ہے نہ کہ جیسا بعض مشائخ کی کتابوں میں ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک حاکم عقل ہے کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس کی جرأت کوئی مدعی اسلام نہیں کر سکتا۔

معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی شخص کوئی خاندان کوئی گروہ اور کوئی قوم حکم کرنے کی مجاز نہیں ہے اسی طرح مجرد عقل اور تجربہ کی بنیاد پر بھی کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا یہ کہہ کر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت ساری چیزیں عقل و تجربہ سے بھی ثابت ہوتی ہیں اسی لیئے فقہ کو اس کی ضرورت پڑی کہ صریح لفظوں میں عقل کی حاکمیت کا انکار کر دیا جائے لیکن قابل رنج بات یہ ہے کہ اس وضاحت کی ضرورت پہلے غیر مسلم فلسفیوں کے مقابل میں پڑی تھی اور آج علمبردارانِ اسلام کے مقابل میں ہے

۲ **اصولِ شریعت**: حاکم اعلیٰ اللہ کے تفصیلی احکام اور قوانین معلوم کرنے کیلیئے صرف چار ذرائع ہیں کتاب، سنت، اجماع، قیاس، کتاب تو اس لیئے کہ وہ صریح طور پر حاکم اعلیٰ کا کلام ہے اور سنت اس لیئے کہ رسول یعنی اس کے نمائندہ کی قولی اور عملی تعلیم کا نام سنت ہے اور اجماع اس لیئے کہ کتاب و سنت سے ثابت شدہ ہے، رہا قیاس اور اس کی دوسری شاخیں استحسان، استصحاب وغیرہ تو ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے بلکہ کچھ خاص شرائط اور قیود کے ساتھ کتاب و سنت کے مخفی احکام معلوم کرنے کے ذریعے بنتے ہیں بجائے خود ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ان چار ذرائع سے جو بھی حکم معلوم ہو گا وہ شریعت کا قانون ہو گا اور ان طریقوں

کو چھوڑ کر جو قانون اور ضابطہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کی تشریعی حاکمیت سے انکار کی دلیل ہے خواہ وہ قانون اور ضابطہ کوئی ایک فرد بنائے یا کوئی قوم اور کسی ملک کے جمہور۔

دین کی ہمہ گیری کا تقاضا: مذکورہ تینوں مسلمات، اسلام کا ہمہ گیر ہونا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت[۲] اور شریعت کے اصول اربعہ کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان کا سراپا دین میں گم ہو جائے اور تمام مسائل زندگی کی اساس دین قرار پائے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو ہر دور میں اجتماعی نظم کی ضرورت رہی ہے جو سب کو کنٹرول کر سکے۔ انتشار اور انارکی اجتماعیت کی ضد ہے اس انتشار اور انارکی کو دور کرنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے ہی کا نام نظام خلافت اور ہماری زبان میں حکومت ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کیوں دین کی بنیاد پر نہ ہو۔ کس دلیل کی بناء پر انسانی زندگی کے اس اہم شعبہ کو خدائی حاکمیت سے آزاد کیا جائے کیا حکومتی عمل خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے علاوہ کسی دوسری دنیا میں ہوتا ہے۔ یہ زمین اس کی، آسمان اس کا ساری مخلوق اس کی تو پھر کس بنیاد پر اس کے حکم کے بغیر تصرف کرنا روا ہو سکتا ہے۔ کیا اس کی کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے کہ اس نے اپنے اقتدار اور اختیار کو محدود کر دیا ہے خدا کے پیغمبروں نے اس کی حاکمیت کے لیئے کوئی لائن کھینچ دی ہے کہ یہ خدائی حکومت کی سرحد ہے اور یہ قیصر کی۔

عقل کا تقاضا: شرعی مسلمات، اسوۂ انبیاء، خلفائے راشدین کی اتباع کا مطالبہ ہے کہ حکومتی عمل بھی اسلام کے زیر سایہ ہو اور خدائی ہدایت کے تحت ہو نہ کہ اس سے آزاد۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے۔ شریعت کے کچھ احکام ہر ہر فرد سے متعلق ہیں اور ایک معتد بہ تعداد ایسے احکام کی ہے جن کی مخاطب پوری امت ہے۔ مثلاً قرآن میں صریح طور سے چور کے بارے میں حکم ہے۔ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹو۔ یہ ایک کھلا ہوا حکم ہے۔ جس کا مخاطب کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بنایا گیا

بلکہ تمام مسلمانوں سے کہا جارہا ہے لیکن اس حکم کی تعمیل ہر ہر شخص الگ الگ نہیں کر سکتا اور نہ بیک وقت پوری امت کے ہاتھوں اس کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ پھر تعمیل کیسے ہو اس کا صرف ایک جواب ہے وہ یہ کہ پوری امت جسد واحد بن جائے اس کا ایک قائد اور سربراہ ہو اس کا اپنا ایک اجتماعی نظم ہو جس کے ذریعے اجتماعی احکام کی تنفیذ عمل میں آئے امت میں انتشار اور انارکی ہو تو شریعت کے بہت سارے احکام کی تعمیل نہیں ہو سکتی اسی بناء پر اسلام میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ میں نہ پڑو)۔

حضور نے فرمایا:- من شذّ عن الجماعة شذّ فی النّار جو جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں گیا۔ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّمَا يَاْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَة تم پر جماعت لازم ہے اس لیئے کہ بھیڑیا انہی بکریوں کو کھاتا ہے جو گلہ سے بچھڑ جاتی ہیں۔

عہد رسالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات خود اللہ کی جانب سے پوری امت کی راہبر اور ذمہ دار تھی اور وہ سب احکام جو اجتماعیت سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے ہاتھوں انجام پاتے اور آپ کے وصال کے بعد صحابہ اکرام نے اس ذمہ داری کو کما حقہ، ادا کیا اور رسول خدا کی امت انتشار کی شکار نہیں ہوئی۔

اجتماعیت کے اسی نظام کو اسلام کی اصطلاح میں خلافت و امارت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی خلافت کو ہم اسلامی حکومت یا حکومت الٰہیہ کہتے ہیں یہ حکومت مختلف ناموں سے ہر دور میں مسلمان کا مطمع نظر اور اس کے نزدیک حکومت کا سب سے اعلیٰ معیار رہی ہے۔ اور اس کو یہ یقین رہا ہے کہ اس کا قیام ایک فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ

دنیا سے شر و فساد مٹا کر امن قائم کرنے کی واحد تدبیر ہے۔

اسلامی خلافت اوپر کی گفتگو سے اسلامی حکومت اور خلافت کی تعریف خود متعین ہو جاتی ہے لیکن مزید توضیح کیلئے میں یہاں ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعریفیں نقل کرتا ہوں۔ ابن خلدون نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے: "خلافت کے لغوی معنے جانشینی اور اس کا اصطلاحی مفہوم آنحضرت صلعم کے جانشین کی حیثیت سے مطلق دین اور دنیاوی امور میں فرمانروائی کا حق تھا خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطہ نظر سے دینی و دنیاوی معاملات میں فرمانروائی کی حامل تھی۔ یہ فرمانروائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی خلافت کا حقیقی مقصد ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویہ نگاہ سے حکومت کے نظم و نسق کی تنظیم اور اسکا قیام تھا"
مقدمہ (ص ۱۶۶)

شاہ ولی اللہ صاحب نے خلافت کی تعریف یوں کی ہے۔

"هی الرياسة العامة فی التصدی لاقامة الدين باحياء العلوم الدينيه واقامة اركان الاسلام والقيام بالجهاد وما يتعلق به من ترتيب الجيوش الفرض للمقاتلة واعطاءهم من الفئ والقيام بالقضاء واقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنهی عن المنكر نيابة عن النبی صلی الله عليه وسلم (ازالة الخفا)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں علوم دینیہ کے زندہ کرنے اور ارکان اسلام کو قائم کرنے اور جہاد اور متعلقات جہاد جیسے لشکروں کو تربیت دینے مجاہدین کو وظائف دینے مال غنیمت کو تقسیم کرنے اور عہدۂ قضا کے فرائض انجام دینے اور حدود کو قائم کرنے اور مظالم کو رفع کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اقامت دین کا اہتمام کرنے والی ریاست عامہ کو خلافت کہتے ہیں۔ یہ دو اقتباس اسلامی حکومت کی تعریف متعین

کرنے کیلئے بالکل کافی ہیں۔ اسلامی حکومت کے مقاصد اور دائرہ کار کو غیر مبہم الفاظ میں یہاں واضح کر دیا گیا ہے اب جو لوگ دعوی کرتے ہیں کہ اسلام میں حکومت کا کوئی خاص تصور اور خاکہ نہیں ہے۔ کہ ان سے پوچھا جائے کہ اگر یہ خاص تصور نہیں تو کیا ہے کسی ہیت کا متعین نہ ہونا اور بات ہے اور مقاصد دائرہ کار آئیڈیالوجی کا متعین نہ ہونا دوسری بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت علمی اور نظری، عملی اور واقعاتی ہر لحاظ سے ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلفائے راشدین نے جس نوعیت کی حکومت بنائی وہ حکومت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور اس کا نام اسلامی حکومت ہے۔ لیکن حقائق کو جھٹلانے پر اگر کوئی تل جائے تو اس کا علاج ہی کیا ہے۔

اقامتِ خلافت کی دینی حیثیت اسلامی حکومت کی تعریف متعین ہو جانے کے فوراً بعد یہ سوال آتا ہے کہ اس کو برپا کرنے کی دینی حیثیت کیا ہے۔ فرض ہے، نفل ہے مباح ہے۔ آخر کیا ہے۔

شریعت اسلامی کا یہ ایک کلیہ اور طے شدہ اصول ہے کہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی جن چیزوں پر موقوف ہوتی ہے وہ بھی فرض اور واجب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وضو کی فرضیت کے ساتھ ساتھ پانی کے حصول کی کوشش بھی بقدر استطاعت فرض ہے اگر کوئی شخص وضو نہ کرنے کی وجہ بتائے کہ میں مسجد میں گیا لیکن وہاں پانی موجود نہ تھا تو اس کا یہ عذر کسی بھی طرح وضو کی فرضیت کو ساقط نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس پر کنویں سے پانی نکالنا یا کسی سے طلب کرنا ویسے ہی فرض ہے جیسے وضو فرض ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ پانی کے حصول کے لیئے جو ذرائع اور وسائل اکٹھا کرنے ضروری ہیں ان سب کا مہیا کرنا بھی حسب استطاعت فرض ہے۔ اسی بناء پر کسی مسافر کیلئے بھی طلب اور جستجو سے پہلے جائز نہیں کہ وضو کے بجائے

تیمم کر لے بشرطیکہ آس پاس پانی ملنے کی توقع ہو یا اس کے کسی ساتھی کے پاس موجود ہو۔

الا تری ان تحصیل اسباب الواجب واجب و تحصیل اسباب الحرام حرام بالاجماع (اسلم الثبوت ص ۳۸)

کیا تم نہیں جانتے کہ واجب کے ذرائع کا حاصل کرنا واجب اور حرام کے ذرائع کا حاصل کرنا حرام ہے بالاجماع۔

"جس واجب کے اسباب اور شروط کی تحصیل واجب ہوتی ہے اس میں علمائے اصول فقہ نے دو قیدیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ واجب مطلق ہو۔ شارع کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ سبب و شرط مکلف کی مقدرت میں ہوں ان دو قیدوں میں سے کوئی ایک قید بھی اگر غائب ہو جائے۔ تو پھر سبب و شرط کی تحصیل واجب نہ ہو گی۔ پہلی قید کی شرعی مثال وجوب زکواۃ کا مسئلہ ہے۔ چاندی سونے میں وجوب زکوٰۃ کا سبب ایک مکمل نصاب کی ملکیت ہے اور شرط حولان حول ہے لیکن کسی مسلمان پر نہ اس سبب کی تحصیل واجب ہے اور نہ اس شرط کی۔ یعنی کسی مسلمان پر نہ تو یہ واجب ہے کہ وہ جدوجہد کر کے صاحب نصاب بنے اور نہ کسی صاحب نصاب پر یہ واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لیئے وہ سال بھر تک بہر حال نصاب کو محفوظ رکھے اس کی وجہ یہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مطلق نہیں ہے۔ بلکہ شریعت کی طرف سے ایک مقید حکم ہے۔ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان صاحب نصاب ہو اور سال بھر تک اس کے پاس نصاب محفوظ رہے تو اس پر اس نصاب کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس طرح کے مقید حکم و طلب میں کسی شخص پر شریعت کی طرف سے سبب و شرط کی تحصیل کا فریضہ عائد نہیں ہوتا بلکہ جب سبب اور شرط پائے جائیں تو اس حکم پر عمل واجب ہوتا ہے دوسری قید کی مثال نماز کے اوقات ہیں جن کو اسباب کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان اسباب کی تحصیل

کسی پر واجب نہیں، اس لیئے کہ وہ انسان کے بس سے باہر ہیں۔ ایسا واجب جو شریعت کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو بلکہ مطلق ہو۔ لیکن اس کا وجود یا صحت ادا کسی سبب یا کسی شرط پر موقوف ہو تو ایسے سبب یا شرط کی تحصیل واجب ہے۔ مثلاً شارع کسی مسلمان کو مکلف کرے کہ اپنا غلام آزاد کر تو اس واجب کا وجود یعنی اس غلام کی آزادی ایک سبب پر موقوف ہے اور وہ ہے لفظ اَعْتَقْتُ کا نطق یعنی جب تک کوئی شخص یہ نہ کہے کہ "میں نے اس غلام کو آزاد کیا" اس وقت تک غلام آزاد نہیں ہو سکتا لہٰذا اس سبب کی تحصیل اس پر واجب ہو گی یا شارع نے کسی کو مکلف گردانا کہ "علم حاصل کر" ظاہر ہے کہ اس واجب کا حصول چند اسباب پہ موقوف ہے تو ان اسباب کی تحصیل اس پر واجب ہو گی اس لیے کہ ان اسباب کی تحصیل کے بغیر عام حالات میں علم حاصل نہیں ہوتا۔

صحتِ ادا کی مثال نماز میں وضو کی شرط ہے۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وضو وجوب صلوٰۃ کی شرط نہیں ہے بلکہ صحت ادا کی ہے۔ یعنی بات یہ نہیں کہ جب تمہیں وضو ہو تو تم پر نماز واجب ہے بلکہ یہ ہے کہ نماز جو تم پر واجب ہے وہ وضو کے بغیر ادا نہیں ہوتی لہٰذا جس شخص پر نماز واجب ہو اس پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے وجوب زکوٰۃ کی شرط اور صحتِ ادائے صلوٰۃ کی شرط میں بنیادی فرق ہے۔ جس کو سمجھ لینا چاہیئے اسباب و شروط کی تحصیل کے وجوب و عدم وجوب کی تفصیل نہ جاننے کی وجہ سے بعض ذہین لوگوں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ اب ان تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو کوڑے مارنے کی جو مطلق تکلیف مسلمان کو دی گئی ہے اس کا وجود یا صحتِ ادا حکومت کی شرط پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو اس شرط کی تحصیل بھی یقیناً واجب ہو گی۔ بالفرض کوئی شخص

دعوی کرتا ہے کہ قطع ید وغیرہ کا وجوب مطلق نہیں ہے۔ بلکہ مقید ہے تو اسے اس کا ثبوت دینا چاہیے۔

علمائے حق اس پر متفق ہیں کہ نصب امام یا اسلامی حکومت کا قیام ان احکام کی ادائیگی کے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی ان احکام کے وجوب میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اگر خلیفہ موجود ہو اور حکومت قائم ہو تو ان پر عمل کرو بلکہ بات یہ ہے کہ یہ احکام جو تم پر واجب ہیں وہ نصب خلیفہ اور حکومت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے لہٰذا ان احکام پر عمل کرنے کے لیئے تم پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے۔ (ماخوذ)

اس اصول کو جان لینے کے بعد آپ قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی میں مندرج احکام پر ایک نگاہ ڈالیئے اور دیکھئے کتنے فرائض اور واجبات کی ادائیگی کا دار و مدار اسلامی حکومت کا قیام قرار پاتا ہے بطور مثال چند احکام ملاحظہ ہوں۔

جہاد، قطع ید، حد قذف، حد زنا، حد خمر، اور معاملات میں اللہ کی نازل کردہ ہدایات کے مطابق فیصلہ کرنا یہ قرآن کے قطعی احکام ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے۔ ہر مسلمان قرآن میں پڑھتا ہے مدرسوں میں ان پر بحثیں ہوتی ہیں تکرار ہوتی ہے مقررین اور مصنفین ان کی باریکیاں بیان کرتے ہیں، ان کے فوائد اور ان کے اندر پوشیدہ حکمتوں پر سننے والے سر دھنتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو جواب نفی میں آتا ہے اور بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لیئے حکومت ضروری ہے اور آج حکومت اسلامی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب یہ احکام اسلامی حکومت پر موقوف ہیں تو پھر شرطِ موقوف علیہ کی تحصیل ہم پر واجب ہے۔ اوپر کی مثالوں میں سے ایک کی ذرا تفصیل ہم پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مقصود اچھی طرح واضح ہو سکے ہدایتہ کے

محشی لکھتے ہیں:- واما وصف القضاء ففرض کفایة فلو امتنع الکل اثموا وقد امر الله تعالیٰ نبیه صلی الله علیه وسلم بقول "وان احکم بینهم بما انزل الله الیك" وبعث صلی الله علیه وسلم علیاً قاضیاً الی الیمن ومعاذا وعلیه اجماع المسلمین رہا قضا کا حکم تو وہ فرض کفایہ ہے اگر سب لوگ رک جائیں تو گنہگار رہوں گے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت معاذ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ کتاب المبسوط میں کتاب القاضی کی ابتدا ان الفاظ میں کی گئی ہے

اعلم بان القضاء بالحق من اقوی الفرائض بعد الایمان بالله تعالیٰ وهو من اشرف العبادات لاجله اثبت الله تعالیٰ لآدم علیه السلام اسم الخلافة فقال جل جلاله انی جاعل فی الارض خلیفة ط واثبت ذالك لداؤد علیه السلام فقال عز وجل "یاداؤد انا جعلنك خلیفة فی الارض" وبه امر کل نبی مرسل حتیٰ خاتم الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام۔ قال الله تعالیٰ انا انزلنا التوراة فیها هدی ونور یحکم به النبیون وقال تعالیٰ ان احکم بینهم بما انزل الله الیك ولا تتبع اهواهم۔ (ص۵۹)

ترجمہ: جان لو حق کے ساتھ فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل ترین عبادت میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے لیئے خلیفہ کا نام تجویز فرمایا اور ارشاد ہوا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اسی چیز کو داؤد علیہ السلام کیلئے قائم رکھا اور فرمایا اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور اسی بات کا ہر نبی حتیٰ کے خاتم الانبیاؑ کو بھی حکم دیا اور ارشاد ہوا ہم نے تورات اتاری اس

میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے ہیں او نیز ارشاد ہے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو"

اس کے بعد صاحب مبسوط نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام حضرت عمرؓ کے ایک خط سے یہ فقرہ نقل کیا ہے: اما بعد فان القضاء فریضة محکمة وسنة متبعة یعنی قضا ایک محکم فریضہ ہے اور قابل اتباع سنت ہے اور سنت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

سنة متبعه ای طریقة مسلوکة فی الدین یجب اتباعها علی کل حال

یعنی سنت دین میں ایک ایسا لائق پیروی طریق ہے جس کی اتباع ہر حال میں واجب ہے

یہ ہے وہ فریضہ جو تمام انبیاء علیہ السلام پر عائد کیا گیا اور آخر میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیا گیا اور بڑی شد و مد کے ساتھ جس کا اندازہ ان آیات سے ہوتا ہے،

"مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ ظالم ہے۔

مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ فاسق ہے۔

مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ ٥

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ کافر ہے"

مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ فرمائیے اور بتائیے اس فریضہ کی ادائیگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے ہاں یہ واضح رہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں جو جج اور عدالتیں ہوتی ہیں ان کے ذریعہ یہ فرض ہرگز ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ قاضی کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت

ہے کہ صرف نکاح، طلاق اور میراث کے ہی معاملات میں شرعی قاضی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بلا استثنیٰ سارے معاملات زندگی میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ لینے کے علاوہ ایک مومن کیلئے کوئی دوسری راہ نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ ان شرائط وقیود کے ساتھ مقید عدالتیں دنیا کی کس حکومت نے مسلمانوں کو مہیا کر کے دی ہیں یا دے سکتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی اور دیگر بے شمار فرائض سے سبکدوشی اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک با اختیار امام اور خلیفہ کا مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب "شرح عقائد نسفی" میں، صاحب کتاب لکھتے ہیں:

ثم الاجماع علی ان نصب الامام واجب والمذهب انه یجب علی الخلق سما لقوله صلعم من مات ولم یعرف امام زمانه فقد مات میتة جاهلیة ولان الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفات النبی صلی الله علیه وسلم نصب الامام حتی قدموه علی الدفن وکذا بعد موت کل امام ولان کثیرا من الواجبات الشرعیه یتوقف علیه کما اشار الیه بقوله والمسلون لابد لهم من امام یَقُومُ بِتَنْفِیذِ احکامهم واقامة حدود هم رسد تغورهم وتجهیز جیوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتصلة وقطاع الطریق واقامة الجمع والاعیاد وقطع المنازعات الواقعات بین العباد وقبول الشهادات القائمة علی الحقوق وتزویج الصغار والصغائر الذین لاولیاء لهم وقسمة الغنائم۔ (ص۱۱۰)

ترجمہ: پھر اس بات پر اجماع ہے کہ امام کا مقرر کرنا واجب ہے اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق پر واجب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی بناء پر کہ جو مر گیا اور اپنے زمانے کے امیر کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا اور اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت نے سب سے اہم کام امام کے تعین کو قرار دیا یہاں تک کہ

دفن پر مقدم رکھا اور ایسا ہی ہر امام کی وفات کے بعد ہوا اور اس لئے بھی کہ بہت سے شرعی واجبات اس پر موقوف ہیں جیسا کہ ماتن نے اشارہ کیا کہ مسلمانوں کیلئے ایک ایسا امام ضروری ہے جو ان کے احکام کو جاری اور ان کے حدود کی اقامت اور ان کے سرحدوں کی حفاظت اور ان کے لشکروں کی تیاری اور باغیوں، چوروں، ڈاکوؤں کو مغلوب اور جمعہ وعیدین کی اقامت اور لوگوں کے درمیان پیدا شدہ قضیوں کا فیصلہ اور حقوق پر ثابت ہونے والی شہادتوں کو قبول اور لاوارث بچوں اور بچیوں کی شادی اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے کی ذمہ داری اٹھائے۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں۔

اتفق جمیع اهل سنة وجمیع المرجئه وجمیع الشیعة وجمیع الخوارج علی وجوب الامامة وان الامة واجب علیها الانقیاد لامام عادل یقیم فهیم احکام الله ولیسوسهم باحکام الشریعة التی اتی بها رسول الله صلی حاشا النجدات من الخوارج الملل والنحل (ص۴۳)

ترجمہ:۔ تمام اہل سنت، مرجیہ، شیعہ باستثناء نجدات تمام خوارج امامت کے وجوب پر متفق ہیں۔ اور اس بات پر بھی کہ امت پر ایک ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ کے احکام قائم کرے۔ اور لوگوں کا نظم اس شریعت کے احکام کے مطابق چلائے جو اللہ کے رسول لائے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب "ازالۃ الخفاق" میں لکھتے ہیں:

واجب بالکفایة امت بر مسلمین الی یوم القیامة نصب الخلیفة مستجمع شروط بچند وجه یکے آنکه صحابه رضوان الله علیهم به نصب خلیفه وتعین وپیش از دفن آن حضرت صلی الله علیه وسلم متوجه شدند پس اگر از شرع وجوب نصب خلیفه ادراک نمی کردند برین امر خطیر مقدم

نمی ساختند و ایں وجہ اثبات دلیل شرعی از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم می نماید بر وجہ اجمال۔

ایسے خلیفہ کو مقرر کرنا جو جامع شرائط ہو روز قیامت تک مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے چند وجوہ کی بناء پر پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے خلیفہ کے نصب اور تعین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر مقدم رکھا۔ اگر انہوں نے خلیفہ کے تعین کے وجوب کو شریعت سے ادراک نہ کیا ہوتا تو اس اہم کام پر اسے مقدم نہ کرتے یہ صورت اجمالی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دلیل شرعی کا اثبات کرتی ہے۔

ان معتبر حاملین شریعت نے امام اور خلیفہ کے تعین کو فرض کفایہ بتایا اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فریضہ کسی خاص وقت کیساتھ مخصوص یا کسی خاص مقام کیساتھ مقید نہیں ہے ہے اس لیئے مخصوص حالات یا مخصوص ممالک و مقامات اور موہوم خطرات کی بناء پر اس فرض کفایہ کی فرضیت اور اس کے ایک مسلم حقیقت ہونے سے انکار کرنا ایک جرم سے کم نہیں۔ ایک مومن کے لیئے صحیح روش یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق اس کیلئے کوشش کرے اور اگر کوئی اپنے اندر ہمت اور سکت نہیں پاتا تو کم از کم جو بات ہو سکتی ہے وہ یہ کہ کوشش کرنے والوں کیلئے اللہ سے دعا کرے۔ رہے وہ لوگ جو اقتدار وقت کی خوشامد اور ذاتی فائدوں کیلئے اسلامی حکومت کا نام لینے والوں کے سروں پر کلہاڑی مارنے پر آمادہ ہیں۔ انہیں خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے لادینی حکومتوں کے قیام کی تائید کر سکتے ہیں لیکن خلافت علی منہاج النبوت قائم کرنے کیلئے اقامت دین کی تحریک کی تائید نہیں کر سکتے بلکہ اس کے مقابلہ کیلئے محاذ بنا سکتے اور کوشش کرنے والوں کو غیر مسلموں کے سامنے مطعون کر سکتے ہیں۔

؎ ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حکومت مقصود نہیں ہے اس لیئے اسلامی حکومت کو نصب العین نہیں بنایا جاسکتا

لیکن ہم نہیں سمجھ سکے کہ کسی چیز کو قابل رد اور قابل اجتناب قرار دینے کیلئے مقصود اور نا مقصود کی بحث کیوں چھیڑی گئی۔ کسی چیز پر حکم لگانے کیلئے فقہ میں جو اصطلاحیں ہیں انہیں کیوں نہیں استعمال کیا گیا نا مقصود کے بجائے حرام، مکروہ، ناجائز کہنا زیادہ مناسب تھا یہ سیدھا طریقہ چھوڑنے کی وجہ یا تو لفظ غیر مقصود کی فقہی اصطلاح سے ناواقفیت ہے یا لوگوں کو فریب دینے کی کوشش۔ فقہ کی اصطلاح میں کسی شئے کے غیر مقصود ہونے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز غیر اہم اور لائق اجتناب ہے۔ فقہاء نے عبادات کی دو قسمیں کی ہیں مقصودہ اور غیر مقصودہ۔ مثلاً نماز عبادت مقصودہ ہے اور وضو سترِ عورت، استقبالِ قبلہ، اذان غیر مقصودہ ہیں لیکن اس کے باوجود وضو فرض ہے۔ ستر عورت استقبال قبلہ نماز کیلئے شرط ہیں اور اذان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اگر کوئی بستی بالکلیہ اذان کو ترک کردے تو اس سے قتال کیا جائے گا۔ اب ایک شخص کہے کہ یہ ساری چیزیں دین میں مقصود نہیں ہیں اس لیئے نعوذ باللہ غیر اہم اور نا قابل اہتمام ہیں تو اس شخص پر آپ کیا حکم لگائیں گے۔

فقہاء نے امور دین کو پانچ اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ اعتقادات، عبادات، معاملات، آداب حدود اور تعزیرات اس تقسیم کی بناء پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اصطلاح فقہ کی رو سے دین کا کم از کم ⅖ حصہ مقصود نہیں ہے۔ مثلاً قتال فی سبیل اللہ افضل ترین عبادت ہے لیکن اس کے باوجود خود مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کا وسیلہ ہے اسی طرح شریعت کے حدود ہاتھ کاٹنا کوڑے

لگانا، سنگسار کرنا بھی اصلاً خود مقصود نہیں ہیں، لیکن ان کی اہمیت و وجوب کا حال یہ ہے کہ ان کا انکار یا ترک تو دور کی بات ہے ان سے غفلت یا مجرمین کی پاسداری اور رعایت بھی جرم عظیم ہے۔ لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ٥

ان دونوں زانی مرد اور عورت پر تم کو اللہ کے دین میں رحم نہ آئے اگر تمہیں اللہ اور قیامت پر ایمان ہے چنانچہ اس طرح کے سارے احکام فقہاء کی زبان میں مقصود الفعل اور مطلوب التحصیل لغیرہٖ ہیں یعنے جن کا کرنا مقصود ہے جن کی تحصیل کسی غیر شئے کیلئے مطلوب ہے۔

بعض عبادتیں خود مقصود بالذات ہوتی ہیں مثلاً نماز روزہ اور بعض عبادتیں کسی دوسری عبادت کا ذریعہ اور شرط بنتی اور وسیلہ کا کام دیتی ہیں مثلاً وضو نماز کیلئے شرط ہے۔ محض اسی فرق کو ظاہر کرنے کیلئے مقصود اور غیر مقصود کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غیر مقصود احکام غیر اہم ہیں بلکہ تعمیل و ادائیگی کے لحاظ سے عبادات مقصودہ پر مقدم ہیں۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کو غیر مقصود کہنے کی غرض یہ ہے کہ شریعت میں مومن کا مقصد وجود صرف رضائے الٰہی ہے۔ حکومت اصل مقصود نہیں۔ ہم کو تسلیم ہے اور کسی مومن کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مومن کا مقصد وجود رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے ہم اقامت دین اور قیام خلافت کی جد و جہد کے مکلف نہیں ہیں عبادات مقصودہ کا اصل مقصد بھی رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے تو کیا نعوذ باللہ ہم ان کے مکلف نہیں ہیں اور آزاد ہیں کہ جس طرح جی چاہے رضائے الٰہی حاصل کریں۔ اسلامی

حکومت کی اصل غرض تو یہی ہے کہ تمام عبادات اور تمام احکام ٹھیک اسطرح ادا کئے جائیں جسطرح اللہ اور رسول نے ہمیں سکھاتے ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے مومن کا مقصد اصلی رضائے الٰہی ہے۔ لاریب فیہ مگر جو اس کے ذرائع و شرائط ہیں انہیں اگر نامقصود کہہ کر الگ کر دیا جائے تو شریعت کے ایک بہت بڑے اصول کا بطلان لازم آتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز نہیں۔ لیکن اس طریقہ استدلال سے یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اجتماعی احکام پر عمل کرنا یا عمل کرنے کی سعی کرنا بھی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر شریعت کے حدود و تعزیرات کی تنفیذ اور کتاب و سنت کے مطابق مقدمات مخاصمات کے فیصلے بھی ضروری ہیں اور ان کی شرط و وسیلہ حکومت اسلامی کا قیام ہے اب اگر کہا جائے کہ حکومت اسلامی کی بات مت کرو کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے تو ظاہر ہیکہ رضائے الٰہی کی تحصیل کا مکلف بنانا تکلیف ما لا یطاق کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہیکہ شریعت میں انسان کو کسی چیز کا مکلف بنانے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے حصول کیلئے جو اسباب و ذرائع اور شروط ضروری ہیں ان کے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرے اگر وہ کوشش کرتا ہے اور بالفرض منزل تک پہنچنے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے تو وہ کامیاب ہے گویا کوشش ہی اس کی منزل تھی لیکن اگر وہ کوشش بھی نہیں کرتا اور مرجاتا ہے تو پھر رضائے الٰہی کا انمول موتی کس طرح اسے مل سکتا ہے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے اب تک جو گفتگو ہوئی وہ بندے کے لحاظ سے تھی کہ بندہ کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ شریعت وضع کرنے اور انبیاء

و رسل کا سلسلہ قائم کرنے سے خداوندِ عالم کا کیا مقصد ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں، نہ وہ بندوں سے کچھ چاہتا ہے اور نہ بندے اسے کچھ دے سکتے ہیں۔ اس لیئے خالق کائنات کا مقصود صرف یہی ہو سکتا ہے کہ بندے بلا کسی تفریق و استثناء اسکے ہر حکم کی تعمیل کریں اور دنیا و آخرت میں اس کی رحمتوں کے مستحق بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

مَآ أُرِيْدُ مِنْهُم مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ ٥ (الذاریات۔۳۲)

ترجمہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

اس سلسلہ میں علامہ شاطبی نے جو کچھ لکھا ہے اسکا ماحصل یہ ہے کہ۔

شریعت وضع کرنے سے شارع کا مقصد یہ ہے کہ بندے کا قصد شارع کے قصد کے موافق ہو اور اس کا عمل شارع کی منشاء کے خلاف نہ ہو اسلیئے کہ شریعت بندوں کے مصالح کے مطابق اتاری گئی ہے اور اس لیئے بھی کہ انسان اللہ کی عبادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور عبادت کا حاصل یہ ہے کہ شارع کی منشاء پوری کر کے دنیا و آخرت دونوں جہاں میں رحمت خداوندی کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس لیئے کہ بھی شارع کا مقصد شریعت سے ضروریات، یعنی دین، عقل، نسل، نفس، مال کی حفاظت کرنی ہے اور شریعت کے ان مصالح کو بروئے کار لانے میں انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر قائم کرے اور پھر دوسروں پر۔ اسی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته

تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن میں آیا ہے۔

آمنو بالله و رسوله وانفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه (حديد)

انی جاعل فی الارض خليفة

ليستخلفنكم فی الارض فينظر كيف تعلمون ٥

اور اللہ اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔

میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

وہ زمین میں تم کو خلیفہ بنائے گا تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

جعلكم خلائف فی الارض و رفع بعضكم فوق بعض درجت ليبلو لم فی ما اتاكم

اس نے زمین میں تم لوگوں کو خلیفہ بنایا اور تمہارے بعض کو بعض پر فوقیت دی تاکہ تمھیں آزمائے دی ہوئی چیزوں میں۔

یہ خلافت عام ہے کہ ایک فرد کی انفرادی ذمہ داری سے لیکر ایک امیر، ایک خلیفہ وقت کی ذمہ داریوں تک کو شامل ہے۔ جیسا کے حدیث میں تفسیر کردی گئی ہے۔

الامير راع والرجل راع علىٰ اهل بيته والامرأة راعية على بيت زوجها و ولده فكلكم راع و كلكم مسؤل عن رعيته

امیر نگران ہے اور مرد نگراں ہے۔ اپنے گھر والوں پر اور عورت نگراں ہے اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر پس تم مین کا ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے پوچھ ہوگی اس کی رعیت کے متعلق، جب انسان خلیفہ ہے تو لامحالہ اس سے مطلوب اس کے علاوہ کیا ہوگا کہ حاکم اصلی کے احکام جاری کرے اور اس کے مقاصد پورے کرے۔ (موافقات جلد ۲-۲۳۰)

علامہ شاطبی نے جو پہلو یہاں نمایاں کیا ہے اس کی رو سے احکام شرعیہ میں سے بعض کو مقصود اور بعض کو

نامقصود قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے۔ اگر بندے کا مطلوب رضائے الٰہی ہے تو اللہ کو اس کی اطاعت و عبادت اور خلافت مطلوب ہے اسی لیے مومن جب تک نیابت الٰہی کے فرض کو انجام نہیں دیتا اس کا مقصد وجود پورا نہیں ہوتا اور وہ منشائے الٰہی کی تعمیل سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

مسلۂ خلافت و امارت ہندوستان میں

ہماری اوپر کی گفتگو بڑی حد تک منقح ہو گئی ہے کہ مسلمانوں کے لیے کسی امیر یا امام کی اطاعت سے آزاد ہو کر زندگی گزارنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ختم ہونے کے بعد شرعی نظام قائم کرنے کے لیے انگریزی اقتدار سے کسی نہ کسی انداز میں علماء ٹکراتے رہے ہیں۔ شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ، سید احمد شہید مولانا اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ، مولانا قاسم نانوتی اور مولانا محمود الحسن وغیرہ کے حالات زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمیں یہ حقیقت واقعہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

۱۹۱۴ء سے مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے اور مولانا محمود الحسن کو امیر الہند بنا دیا جائے لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ مولانا آزاد کو جب اس طرف سے مایوسی ہو گی کہ پورے ملک کے لیے کوئی متفقہ متحدہ نظم قائم ہو تو پھر انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ اصلاً صوبے وار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے۔ چناچہ جب صوبہ بہار میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا تو مولانا نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارک باد دوں کہ انھوں نے سبقت بالخیرات کا مقام حاصل کیا۔ جمیعۃ العلمائے بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمع علماء نے بالاتفاق اپنا امیر شریعت منتخب کر لیا"۔
(خطبات آزاد۔ ص ۱۳۷)

اس طرح ہمارے ملک ہندوستان میں امیر الہند اور امیر شریعت کے انتخاب اور دار القضاء کے قیام وغیرہ کا تصور اور کوشش کا ایک تسلسل ہے جو ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ یقیناً جن ہستیوں نے جتنا بھی خون پسینہ اس راہ میں بہایا ہے اور بہا رہے ہیں وہ ان کے لیے عند اللہ بلندی درجات کا سبب ہوگا اور اس لحاظ سے خصوصاً امارت شرعیہ بہار ۱۹۲۱ء کی کارکردگی تمام مسلمانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اے کاش ہندوستان کے بقیہ سارے علاقوں میں اسی طرح کی کوشش کی گئی ہوتی لیکن اسی کے ساتھ ہم کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں پر

نصب : امام خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کا جو فریضہ شرعاً عائد ہوتا ہے وہ علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔ اور نظام کفر کے تحت امارت شرعیہ اور دار القضاء کے قیام سے وہ اصل فریضہ ادا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کی ساری کوشش تیمم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن پر اکتفاء اور قناعت کرنا صحیح نہیں ہوگا تیمم ایک عارضی اور مجبوری کی چیز ہوتی ہے۔ لہذا اصل کے لیے کوشش کرنا لازمی فریضہ ہوگا۔

موجودہ حالات بجر میں جو دار القضاء بھی قائم کیا جائے گا اس کی کارکردگی کا دائرہ محدود اور نظام کفر کے تحت دی ہوئی گنجائشوں کے اندر ہوگا۔ مثلاً نکاح، طلاق اور تقسیم وراثت جیسے چند مسائل سے متعلق کوئی قاضی فیصلہ کرسکتا ہے۔ اور اس کو بھی ملک کی عدالتوں میں چیلنج کر کے بے اثر بنایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس دار القضاء کو حکومت کی سند جواز حاصل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جن نصوص قرآنیہ اور دلائل شرعیہ کی بنا پر ہم دار القضاء کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ شادی بیاہ، طلاق اور تقسیم وراثت ہی نہیں بلکہ زندگی کے جملہ معاملات اور نزاعات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق ہو ورنہ ہم ان آیات کے مصداق قرار پائیں گے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکفرون ۞ (سورۃ المائدۃ ۴۴)

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

الم تر الی الذین یزعمون انهم آمنو بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به .

ترجمہ

" اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے۔ اور پھر چاہتے کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کا کفر کریں "۔ کسی غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے تحت جو دار القضاء بھی قائم ہوسکتا ہے اس سے وہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہوسکتا جو دین میں مطلوب ہے اور جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ البتہ یہ حالت مجبوری مجبوری دور کے لیے وہ کرنے کا ایک کام ہے جو کرنا چاہیے۔ شائد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بوجہ ہماری مجبوری اور عدم

استطاعت بھی مقبول ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ہمیں خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کی تمنا اور حتی الوسیع کوشش سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن عام طور پر دیکھا جارہا ہے کہ جو لوگ اس عبوری دور کے فریضہ کی دائیگی کی طرف متوجہ ہیں اسی پر قانع ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اس کے آگے نہ سوچتے ہیں اور نہ عملاً کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں جو انتہائی افسوناک واقعہ ہے۔ اس کے لیے عوام تو خدا کے پاس باز پرس سے شائد بچ جائیں لیکن خواص اور علماء جن کی نگاہ میں قرآن حدیث وفقہ کے اصول و فروع تمام موجود ہیں وہ کس طرح بچیں گے۔

اس طرح جو لوگ خلافت اسلامیہ اور نظام اسلامی کے قیام کی بات کرتے ہیں وہ عبوری دور کے اس فریضہ کی اہمیت کو بڑی حد تک محسوس نہیں کرتے ان سے اللہ کے حضور پوچھ ہو سکتی ہے کہ تم نظام کفر و شرک کو ہٹا کر نظام شرع اگر قائم نہیں کر سکتے تھے تو محدود پیمانے پر ہی سہی تم نے اپنی استطاعت کی حد تک حکم بما انزل کرنے کا نظام کیوں نہیں قائم کیا۔

بہر حال دونوں کام کرنے کے ہیں ہر کام کا دین میں ایک اہمیت اور مقام ہے جس کو ہمیں سمجھنا چاہیے۔ مولانا آزاد کی ایک تحریر سے اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

حضرات!

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کر دوں، جس کو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لیے بمنزلہ اصل واساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے مسلسل غور وفکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدہ کار حل نہیں ہو سکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظام، جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام، جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیات انفرادی کو ترک کر کے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کر لیں۔ یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر وقائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہو جائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہو جائے۔ یہی اصل اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات

اسلام کے نظام اجتماعی کی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل وتوفیق الٰہی سے اس وقت میرے گرد وپیش موجود ہے ۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں فرادی، متفرق الگ الگ اور متشتت نہ ہوں، ۔ ہمیشہ مجتمع، موتلف متحدہ اور نفس واحدہ ہوکر رہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں جابجا اجتماع ووحدت پر زور دیا گیا اور کفر وشرک کے بعد کسی بد عملی سے بھی اس قدر اصرار وتاکید کے ساتھ نہیں روکا جیسا کہ تفرقہ وتشتت سے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام واعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ محور ومرکز کے قرار پائی اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قائم کیئے گئے عقیدہ توحید سے لے کر تمام عبادات واعمال تک یہ حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے ۔ اور اسی بناء پر بار بار نظام جماعت پر زور دیا گیا۔

علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ (رواہ ترمذی)

اور علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین بعد ۱۴۳ (رواہ البیہقی)

اور اذکان ثلاثۃ فی سفر فلیوم واحدکم ۱۴۴ (رواہ اصحاب السنین)

اور اسی لیے نظم وقوام ملت کی منصب خلافت کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہوجائیں ۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب وسنت اس بارے میں بے شمار اور حد احصاء واستقصاء سے باہر ہیں ۔ رسالہ خلافت میں پر بحث کر چکا ہوں، اور زیادہ شرح وتفصیل تفسیر قرآن میں ملے گی ۔

میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا، کیونکہ گزشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازہ اجتماع پراگندہ ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے، مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ایں ہمہ تفریق وپراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی اور جب تک وہ قائم رہی نظام، جماعت بھی قائم رہا ۔ لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانان ہند کا نظم، جماعت درہم برہم ہوگیا اور سرتاسر جاہلیت کی سی بے نظمی وبے قیدی ہم پر چھاگئی ۔ بلاشبہ مرکزی خلافت آل عثمان کی موجود تھی اور مسلمانان ہند کے لیے بھی تمام مسلمانان عالم کی طرح وہی خلیفہ ومطاع تھے لیکن مسلمانان ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق فعلاً وعملاً پایگاہ خلافت سے قائم کرتے اور اس کے ایک موجود وعامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنے فرض اسلامی

انجام دیتے اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا اور واقعی بات یہ ہے کہ دشوار تھا اعادہ حال اور ہتمیۂ کار اور ادائے فرض اسلامی میں کوشاں ہوتے۔ لیکن بد بختانہ ایسا نہیں ہوا اور جہاں غیر مسلم غلبہ واستیلاء پر محکومانہ قناعت کرلی گئی وہیں اس اولین فریضۂ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہر حال ایک زمانہ دراز اس پر گزر گیا اور اب حالت یہ ہیکہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرہ ارض میں سب سے بڑی ایک جا اسلامی جماعت ہے ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتہ انسلاک ہے نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ۔ نہ تو کوئی قائد و امیر ہے اور نہ کوئی آمر و ناہد شرع۔ محض ایک بھیڑ ہے ایک انبوہ ہے، ایک گلہ ہے، جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی وجاہلی ہے جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہو گئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد و شرور میں ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا باب قضاء گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ کیونکہ قضاء کا وجود بلا قاضی کے نہیں ہو سکتا اور قاضی کا وجود امارت و امامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات!

ایک منصب قضاء ہے ایک منصب امارت ہے دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ قضاء امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحت ہے، مگر مقاصد امارت قضاء سے حاصل نہیں ہو سکتے، پس یہ مقاصد امارت کے فقدان کا ذکر کر رہا ہوں، صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا جس کے لیے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات!

اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد اعمال ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا احیائے تجدید ملت اور قیام شرع و ادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور انبوہ لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں جن کے لیے اولین شرط عقلاً و شرعاً وجود جماعت منظمہ اور امارت صحیحہ شرعیہ ہے۔ چھوڑ دیجئے، مصطلحات شرعیہ کو اگر ان سے ہمیں اس قدر بعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کے لیے تیار ہیں مگر بحکم اشمازت قلوب الذین لا یومنون بالاخرۃ (۱۳۵) طریق شرعی اور اس کے نظام وقوام کے الفاظ سن کر یکایک متوحش و مضطرب الحال ہو جاتے ہیں تو صرف انہی قواعد و اصولوں کو سامنے لائیں جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں؟ میں

پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قائد اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے بھی لفظ امیر یا امام میں مضمر رکھی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جاتا ہے تو آپ اس کا استقبال کریں اور امیر و امام کا لفظ آجائے تو نفرت و استکراہ سے بھر جائیں۔ کیا یہ وہی غلطی نہیں جس کو راہ تاسیس اور راہ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑیئے۔ آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض شرعی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے جو آزادی ہند اور مسئلۂ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ آج ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت تک سرشار غفلت تھے۔ اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت و اعانت خلیفہ عہد، حفاظت و صیانت بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلام انجام دیں۔ خدارا بتلائیے اس صورت حال میں بھی طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟ اور ایسے وقتوں کے لیے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام کار بتلایا ہے یا نہیں؟ یا وہ باوجود دعویٰ تکمیل شرع اس قدر نامراد ہو گیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں؟ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے؟ یا محض انجمن سازی اور ہنگامۂ مجالس آرائی؟ کیا محض اتباع ارائے رجال اور تقلید ارباب فن و تخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلاد تاتار و چین سے اٹھے تھے اور تاتاریوں کے استیلا سے تمام عالم اسلامی تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیہ اسلامیہ کا یہی حال تھا جو آج نظر آرہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ و استیلا ہو گیا تھا وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لیے ولاۃ مسلمین کے نصب و تقرر کا حکم دیا۔ اسی بنا پر فقہائے متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلاد محکمہ کفار میں طلب والی مسلم امارت واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ نے انہیں بلاد محکمہ تاتار کے لیے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہیے اور ایک لمحہ بھی بغیر کسی امیر کے بسر نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرائض شرعیہ انجام دیں۔

فی الحقیقت احکام شرعیہ کی رو سے مسلمانان ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں

یا تو ہجرت کر جائیں یا نظام جماعت قائم کر کے ادائے فرض ملت میں کوشاں ہوں" مولانا آزاد رحمہ اللہ علیہ نے جن دو راہوں کی نشاندہی فرمائی ہے وہ کتاب و سنت، تاریخ انبیاء اور سیرت خاتم النبیین اور دینی مسلمات کی روشنی میں فرمائی ہے - در حقیقت تیسری راہ یعنی اہل کفر و شرک کے مستقلاً اور بلا کراہیت ماتحت اور زیر نگیں ہو کر رہنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے - استثنائی اور عارضی صورت حال کی بات الگ ہے کہ اس وقت ارتکاب حرام کی بھی اجازت نکل آتی ہے لیکن اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہجرت کا مرحلہ دوسرے نمبر پر ہے - دینی اور شرعی زندگی گزارنے اور اشاعت دین اور غلبہ حق کے لیے راہیں جب بالکل بند ہو جائیں تو ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے اس کوشش کے بغیر ہجرت کرنا فرار اور اپنی ذمہ داریوں سے گریز کے ہم معنی ہو گی جو ناقابل معافی جرم ہے -

قیمت — ۴/-
ناشر — مکتبۂ النجوم سعید آباد حیدرآباد

ملنے کے پتے

- مکتبۂ النجوم 16-1-11 سعید آباد حیدرآباد 659
- الکتاب پبلشرز میور کامپلکس عابڈس حیدرآباد
- القلم پبلشرز سعید آباد حیدرآباد
- کوثر ایجنسی چھتہ بازار حیدرآباد